جناب انور الجندی
مترجم: محمد اسحاق بھٹی

اسلام اور مغرب

مسلمانوں کی رواداری

ابتدا ہی سے مغرب نے اسلام کو اپنا دشمن اور حلیف قرار دے رکھا ہے اور ہمیشہ کوشاں رہا ہے کہ کسی طرح اس عظیم اور زبردست قوت کو ختم کر دے اور اصلاحِ احوال کی اس عالمگیر طاقت کو جو اسلام کے زیرِ سایہ تیزی سے ترقی کی منزلیں طے کر رہی ہے، نابود کر کے رکھ دے۔ لیکن اس کے برعکس اسلام کی ہمدردیٔ انسانیت ملاحظہ ہو کہ جب مسلمان ہسپانیہ میں داخل ہوئے اور اس خطۂ ارض پر اسلامی پرچم لہرانے لگا تو انھوں نے وہاں کے باشندوں کو مذہبی آزادی کی نوید سنائی، ان کے مجلسی رسوم و عوائد کو علیٰ حالہٖ قائم رہنے دیا، وہاں کے حکام کو ہر قسم کی سہولتیں بہم پہنچائیں، اور حکومتِ اسلامی کے مناصبِ رفیعہ اور خلفا کے محلات و قصور میں رسائی کے آزادانہ مواقع مہیا کیے۔ اس حریت و آزادی کا نتیجہ یہ ہوا کہ یورپ کے یہودی جو طویل مدت سے یورپین حکمرانوں کے ظلم و استبداد کی چکی میں پس رہے تھے، ترکِ وطن کر کے اندلس میں سکونت پذیر ہونے لگے اور وہاں کے نئے عرب حکمرانوں کے عدل و انصاف کی ہمہ گیریوں سے بہرہ ور ہوئے۔

اہلِ یورپ کا تعصب

مگر اس کے ساتھ ہی مغرب کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ آٹھ صدیوں کے بعد جب اہلِ مغرب اُندلس پر قابض ہوئے اور اس کے ایوانِ حکومت کو اپنے تسلط میں لیا تو نہ صرف مسلمانوں کے ساتھ بہتر سلوک روا نہ رکھا، بلکہ ان کو ہدفِ ستم ٹھہرایا، ان کے قتل و غارت کو ضروری قرار دیا، ان کی ہلاکت و تباہی کے لیے تمام کوششیں وقف کر دیں اور غرناطہ و قرطبہ میں عربوں کے جو بے شمار کتب خانے وہاں کے اہلِ علم اور حکومت نے بدرجۂ غایت محنت سے قائم کیے تھے اُن کی آن

ن نذرِ آتش کر ڈالے۔ غرض مغرب نے ان پر بے شمار مظالم ڈھائے۔ یہاں تک کہ ان کی مذہبی آزادی تک سلب کر لی۔ ان پر عبادت کے دروازے بند کر دیے اور مسلمانوں کو مجبور کیا کہ عیسائیت کا قلادہ اپنی گردنوں میں ڈالیں۔ جس کے نتیجہ میں ہزاروں مسلمان مرتد ہو گئے اور ان کی بہت بڑی تعداد سرحدات افریقہ کی طرف ہجرت کرنے پر مجبور ہو گئی۔ کہتے ہیں: جن مسلمانوں کو سرزمین اندلس سے جبری ہجرت کرنا پڑی ان کی تعداد نصف ملین سے کسی صورت میں کم نہ تھی۔

تاریخی لحاظ سے اندلس پر مسلمانوں کا قبضہ بہت کم عرصہ رہا۔ یعنی ۹۳ھ سے ۳۹۰ھ منصور بن ابی عامر کے آخری ایام حکومت تک ــــ اس کے بعد عربوں اور افرنگیوں کے درمیان دوبارہ جنگ شروع ہو گئی۔ اس اثنا میں اندلس پر تسلط جمانے کے لیے کبھی مرابطہ آگے بڑھے اور کبھی ملثمہ! یہ جنگ پورے یورپ میں پھیل گئی، اور سوائے غرناطہ کے کوئی مقام جنگ کی ہولناکیوں سے محفوظ نہ رہا۔

اب اندلس میں محکمہ تفتیش و محاسبہ کا دور شروع ہوا اور اس وقت سے لے کر آج تک ہر سال ۲ جنوری کو اندلس سے مسلمانوں کے اخراج کی خوشی میں متواتر چوبیس گھنٹے چرچ حمرا میں گھنٹے بجائے جاتے ہیں۔

تاریخی شہادتیں

ڈوزی کہتا ہے: آٹھ صدیوں کے بعد جب مسیحی اندلس میں آئے تو انھوں نے عربوں سے بہتر سلوک کا مظاہرہ نہیں کیا۔ اصل بات یہ ہے کہ مسیحی اسی دن کے منتظر تھے۔ انھوں نے مسلمانوں کو مذہبی اعتبار سے تو ابتلا و آزمائش میں ڈالا ہی تھا، ان کو موت کے گھاٹ بھی اُتارا، ان کی اجتماعی قوت کو منتشر کیا اور ہر قسم کی مصیبتوں سے دوچار کیا۔

لیورنٹی کے بیان کے مطابق مسیحی دورِ اقتدار میں دس لاکھ مسلمان اندلس سے جلاوطن کیے گئے۔ ایک اور مؤرخ کا کہنا ہے کہ نو لاکھ مسلمانوں کو اندلس سے نکالا گیا اور بقول اس کے جن مسلمانوں کو زنداں میں ڈالا گیا یا مختلف سزائیں دے کر جن کی زندگیوں کا خاتمہ کیا گیا، یا جنھیں آگ میں جلایا گیا، ان کی تعداد اس کے علاوہ ہے۔

لیورنٹی جو ہسپانیہ کے سب سے بڑے خفیہ محکمۂ تفتیش و محاسبہ کا سکریٹری تھا، لکھتا ہے:

"مسلمانوں کے بارے میں بہت سے فیصلے میرے علم ومطالعہ میں لائے گئے۔ میں نے انھیں پڑھا تو کانپ اُٹھا اور مجھ پہ دہشت طاری ہوگئی۔ محکمۂ تفتیش پر مامور لوگوں نے تو انتہائی وحشت و بربریت کا مظاہرہ کیا۔"

راہب کونیٹس نے اسلامیات سے متعلق ۸۰ ہزار کتابوں کو آگ میں جلایا۔

ایف۔ بارٹونڈ عیسائیوں سے متعلق مسلمانوں کی رواداری کا اور مسلمانوں پر عیسائیوں کے مظالم کا تذکرہ کرتے ہوئے کہتا ہے:

"جو نصاریٰ مسلمانوں کے دورِ اقتدار میں ہسپانیہ میں فروکش تھے ان کو ظلم وعدوان کی ان بے پناہیوں کا کبھی تصور بھی نہیں ہوا جو عیسائیوں نے اپنے زمانۂ حکومت میں مسلمانوں پہ روا رکھے۔"

ہسپانیہ کا یہ معاملہ ان صلیبی جنگوں کے اعادہ وتکرار کی حیثیت رکھتا ہے جو پطرس نامک نے عالم اسلامی میں پھیلائیں اور جن کا سلسلہ تقریباً دو سو سال تک جاری رہا۔

صلیبی جنگیں

۱۰۹۹ء میں فرنگیوں کا عظیم لشکر جو چالیس ہزار نفوس پر مشتمل تھا بیت المقدس کے دروازہ کے سامنے نمودار ہوا اور باشندگانِ شہر کو پورا ایک مہینہ سخت تکلیفوں میں مبتلا رکھنے کے بعد شہر پہ اچانک حملہ کر دیا اور تلوار کو میان سے نکال لیا اور بلا امتیاز مردوں، عورتوں اور بچوں کی گردنیں تن سے جُدا کر ڈالیں۔ اس پر ہی بس نہیں کی بہت بڑی تعداد میں مسلمانوں کے سروں، ہاتھوں اور پیروں کو شہر کی بڑی بڑی شاہراہوں پہ لٹکا دیا گیا۔

اسی زمانے میں صلیبیوں کے قائد نے پوپ کو یہ مشہور جملہ لکھ کر بھیجا تھا کہ ہیکل سلیمان اور ان کے معبد میں مسلمانوں کا اس کثرت سے خون بہایا گیا ہے کہ ہمارے گھوڑے خون کے دریا سے تیر کر اپنے تھانوں کو جاتے ہیں۔

معاملہ اس حد تک پہنچ گیا تھا کہ ان مسلسل صلیبی حملوں میں یورپ کے تمام بادشاہ متحد ہوگئے تھے شاہ روس فرڈریک، شیر دل رچرڈ اور فلپ اوگسٹس سب بیت المقدس میں آ گئے تھے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھیں سلطان صلاح الدین ایوبی نے قید کر لیا تھا لیکن ان کے ساتھ نہایت ہی بہتر سلوک کیا۔ پھر

ان سے یہ عہد لے کر چھوڑ دیا کہ وہ دوبارہ مسلمانوں پر حملہ نہیں کریں گے لیکن انھوں نے پھر عہد شکنی کی۔

لوئی شش دہم جو قدیس کے لقب سے ملقب تھا، ۱۲۴۹ء کے حملۂ دمیاط میں شریک تھا، اس کو اور اس کے اہلِ خانہ کو بھی گرفتار کر لیا گیا تھا۔ رہائی کے بعد یہ ایک اور صلیبی حملہ میں شرکت کے لیے۔ جو ۱۲۷۰ء میں تونس پر کیا گیا۔ یورپ گیا۔

پوپ اوربانوس دوم کے زمانہ میں ۱۰۹۵ء میں کلیرمون کے مقام پر عیسائیوں کا ایک اجتماع ہوا جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس پر انتہائی رکیک حملے کیے گئے۔ لیکن ادھر مسلمانوں کا یہ حال تھا کہ بیت المقدس میں وہ پیغمبرِ نصاریٰ حضرت عیسٰی علیہ السلام کا بہترین الفاظ اور بدرجۂ غایت تکریم سے ذکر کرتے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ یورپ کے ساتھ اسلام نے بہت ہی فیاضی اور نرمی کا برتاؤ کیا۔ یہ کس درجہ اہم اور قابلِ ذکر واقعہ ہے کہ عباسی حکمران خلیفہ ہارون الرشید نے ۸۱۰ء میں چارلمن کو بیت المقدس کی کنجیاں بھیجیں اور اسے کہا کہ مسیحی زائرین کے لیے سہولت و آرام کے جن وسائل و اسباب کی ضرورت ہے بلا تأمل مہیا کیے جائیں۔ اس زمانے میں بیت المقدس میں مسیحی زائرین کے قافلے ہر سال آتے تھے اور انھیں سفر اور قیام کی تمام آسانیاں حاصل تھیں۔

انصاف پسند مؤرخین کے نزدیک تاریخ یورپ میں سات صلیبی جنگیں ہوئیں اور یہ ان کے تعصب کی بہت بڑی دلیل ہے۔ پھر اس میں لائق تذکرہ بات یہ ہے کہ وہ ہر نوع کے حربی اور عسکری سامان سے لیس ہو کر پورے زور سے حملہ آور ہوتے تھے۔ ان صلیبی جنگوں کی بڑی وجہ یہ تھی کہ اہلِ یورپ کے دل میں اہلِ مشرق کے بارے میں یہ احساس اور خوف کروٹ لینے لگا تھا کہ یہ بہت ہی طاقت کے مالک بن گئے ہیں اور وہ دن دُور نہیں جب مسلمان یورپ کی طرف کوچ کرنے لگیں گے۔ چنانچہ انھوں نے فیصلہ کر لیا کہ ان کی طاقت کو ختم کر دیا جائے اور ان کے حربی وسائل کی جڑ کاٹ دی جائے۔ لیکن اس کے برعکس اہل مغرب نے صلیبی جنگوں کے دَور میں مسلمانوں کو فیاضی و حسن معاملت اور فراخ حوصلگی کے جذبات سے بھرپور پایا، اور گھڑسواری، قلعوں کی تعمیر، خندقیں کھودنے اور مضبوط و مستحکم عمارتوں کی تعمیر کا فن مغرب نے مشرق ہی سے سیکھا۔ صلیبیوں نے قدس، کرک، طرابلس اور نصیریہ میں

جو کچھ کیا، وہ دراصل مشرق میں یورپی استعمار اور نوآبادی نظام کی واضح علامات ہیں بلکہ کہنا چاہیے کہ اس نظام میں وسعت کی طرف پہلا قدم ہے۔

حملۂ استشراق

ان حملوں کے ساتھ ہی ایک اور حملہ ہے، جو یورپ نے مشرق پر کیا اور وہ مشنری مستشرقین کا حملہ ہے۔ اس حملۂ استشراق کے ڈانڈے بھی صلیبی حملوں کے ساتھ ملے ہوئے ہیں۔ مستشرقین نے قرآن کے غلط تراجم شائع کیے اور ابن سینا، غزالی، فارابی اور الف لیلہ کے ترجموں کو فروغ دیا ابتدائی مستشرقین راہب تھے، اور انھوں نے اس مہم کا آغاز کیا کہ خصوصیت سے غالی صوفیا مثلاً دروزیہ، ناصریہ اور اسماعیلیہ کی کتابوں کی نشر و اشاعت کا اہتمام کیا جائے۔ اس سے مستشرقین کا مقصد کوئی خدمتِ علم نہ تھا بلکہ ان کا مقصد اس سے صرف یہ تھا کہ مسلمانوں کو صحیح شکل و صورت میں پیش کرنے کی راہ میں رکاوٹیں حائل کی جائیں اور ایسی چیزیں سامنے لائی جائیں جو غلط نتائج و مظاہر کی تخلیق کرتی ہوں، جن میں الجھاؤ پایا جاتا ہو، جو رسائی فہم و فکر کی حدود سے باہر ہوں، جو ظن و تخمین کی داعی ہوں، جن سے شکوک و شبہات کے جذبہ کی تسکین ہوتی ہو، جن کی بنیاد اختلاف اور روایاتِ ضعیفہ پر ہو اور جن کی پوری عمارت سوئے ظن کی کمزور دیواروں پر کھڑی کی گئی ہو۔ اس قسم کی کوششوں میں مارگولیس نتالی اور لڈکر ایسے بڑے بڑے مستشرقین خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں اور ان مساعی کو پروان چڑھانے میں یہ بڑے سرگرم عمل نظر آتے ہیں۔

جب مشنری وفد مغلوں کے پاس گئے تو اس کے پس منظر میں بھی ان کی یہی خواہش کارفرما تھی کہ کسی صورت میں بیت المقدس دوبارہ عیسائیوں کے قبضہ میں آجائے۔ ان مشنریوں میں رامنیدکل ایسے لوگ بھی شامل تھے جن کا منتہائے نظر باشندگانِ ایشیا کے مذہبی رجحانات کو عیسائیت میں بدلنا تھا چنانچہ اسی نام پر جنگی حملہ کیا گیا اور ان مسلسل حملوں سے یورپ کا مدعا یہ تھا کہ اسلام کی آواز کو یورپ اور ایشیائی منطقوں کے درمیان محدود اور محصور کرنے کے لیے ان علاقوں کو اپنے زیر تسلط کیا جائے، تاکہ اسلام کا یہ عقیدہ چند لوگوں کی کمزور اور بے اثر آواز ہو کر رہ جائے۔

بارکر کہتا ہے جو ملاح مشرق کے لیے عازم سفر ہوتے وہ اپنے سینوں پر صلیب لٹکائے رکھتے اور ان کے اندر یہ جذبہ موجزن ہوتا کہ بحر ہند کے ان سفروں میں وہ سرزمین بیت المقدس کی

آزادی کے لیے سرگرم عمل رہیں گے۔ جب کولمبس نے ہندوستان کے بجائے جزائر کا یہ نیا دریافت کیے اور جو عیسائی اس ضمن میں اس کے ساتھ سرگرم عمل ہوئے اور جنھوں نے بحرِ جنوبی سے مشرق کی جانب عنانِ توجہ مبذول کی، ہمارے نزدیک اس سے درحقیقت ان کا مقصد مسیحیت کی ترویج و اشاعت کے لیے راہیں ہموار کرنا تھا۔

مشرق میں جن مشنریوں نے قبضہ جمایا اور اس کے جو مبلغ اور کارندے ہندوستان اور جاوا میں پھیلے وہ اشاعتِ اسلام کی راہ میں رکاوٹیں ڈالتے اور اس کی تبلیغ میں رخنہ اندازی کرتے تھے۔ مشنریوں نے مبلغ بھیجے، کالج قائم کیے اور اپنے مدارس کی طرح ڈالی۔

موسیو شاتلی جو ۱۹۱۰ء میں دعوتِ عنصری کے زعما میں سے تھا، کہتا ہے مشرق میں فرانس کی سرگرمیاں عملی تربیت کے انداز کی ہونی چاہئیں۔ کام کی رفتار کو راہبوں کے طریقِ کار تک محدود رکھنا مناسب نہیں۔ اب ہمیں فرانسیسی کالجوں کے پرچم تلے تعلیم کو عام کرنے پر زور دینا چاہیے۔ مجھے امید ہے، یہ تعلیم عملی طور سے مسلمانوں میں اس درجہ پھیل جائے گی اور وسعت حاصل کرلے گی کہ ان کے اسلامی مدارس میں بھی اس کی نشر و اشاعت ہو گی۔

مسٹر پولس اپنی ایک کتاب میں کہتا ہے:

"مذہب اسلام افریقہ میں عیسائیت کی تبلیغ اور اس کی ترقی کے راستہ میں ایک مضبوط دیوار کی حیثیت رکھتا ہے اور مسلمان ہی ہے جو ہمارا شدید ترین دشمن ہے اس لیے کہ انجیل کی نشر و اشاعت کے لیے نہ تو وہاں کے باشندوں کی جہالت سدِّ راہ ہے، نہ ان کی بُت پرستی اور نہ مسیحیت اور غیر مسیحیت کا مقابلہ! پھر اس باب میں ہمارا حریف وہ عرب بھی نہیں جو کاروبار کے سلسلہ میں شہر بشہر گھومتا ہے۔ بلکہ ہمارا مدِّ مقابل اور حریف وہ شیخ اور درویش ہے جو افریقہ میں اس درجہ اثر و نفوذ رکھتا ہے کہ افغانستان میں بھی اس کا اتنا اثر نہیں۔"

مشنری مبلغین کا قائد زویمر اپنے ایک مضمون میں جو اس نے ۱۹۱۱ء میں مشنری حملوں کے نتائج سے متعلق لکھا تھا، کہتا ہے:

"عقاید اسلام اور اس کے فطری مبادیات کو بدلنے کے لیے مشنری مبلغین نے جس سرگرمی کا

مظاہرہ بلادِ عثمانیہ اور مصر اور دیگر مقامات میں کیا وہ اس سے کہیں زیادہ ہے جو انھوں نے مغربی ممالک میں کیا۔ لیکن یہ بات بلا شک و تردید کہی جا سکتی ہے کہ مشنری تبلیغی کوششیں اس سے عاجز ہیں کہ مسلمانوں کے دلوں کی گہرائیوں سے اسلام کو نکال سکیں، اور اس باب میں ان کے مضبوط قدموں میں ادنیٰ لغزش بھی پیدا کر سکیں۔ اس میں کامیابی کی واحد صورت یہ ہے کہ ان افکار و خیالات کو پھیلایا اور عام کیا جائے جو اسلام کی بنیاد کو کھوکھلا کرنے کے لیے یورپی زبانوں اور یورپی لٹریچر میں پائے جاتے ہیں اور ایسے ذرائع پیدا کیے جائیں کہ جن سے اسلام کی مادی حیثیت پر زد پڑتی ہو۔"

اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ اسلام پر استشراق اور ان مشنری حملوں سے مغرب کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کے دلوں سے اسلام کی بنیادوں کو ہلا دیا جائے اور علم کے نام اور مادی ذرائع سے اس عقیدہ میں تزلزل پیدا کیا جائے۔ بیس سال سے زیادہ تجربہ کے بعد مشنری مبلغین اور عیسائیت کی نشر و اشاعت کے لیے تگ و دو کرنے والوں کو معلوم ہوا کہ مسلمانوں کے قلوب میں اسلام کے اثرات اس درجہ راسخ اور اس کی جڑیں اس قدر گہری اور مضبوط ہیں کہ کوئی طاقت ان پر اثر انداز نہیں ہو سکتی اور اسلام کا سایہ وہاں تک پہنچ چکا ہے کہ جہاں کسی مذہب کی رسائی ممکن نہیں۔

"اسلام دوراہے پر" کا مؤلف کہتا ہے:

"ابتدا میں مستشرقین عیسائی مبلغین ہی تھے۔ یہ لوگ مختلف شہروں میں گھومتے اور یورپی نقطۂ نظر کے مطابق اسلامی تعلیمات اور اس کی تاریخ کو ہدفِ تنقید ٹھہراتے تھے۔"

بعد ازاں استشراق اگرچہ مشنری اثر و رسوخ سے آزاد ہو گیا لیکن اس کا یہ عقلی نقطۂ فکر علیٰ حالہٖ قائم رہا۔ چنانچہ گذشتہ جنگ کے آخری دور میں جب بیت المقدس ان کے زیر انتداب آیا تو ایک اعلیٰ فوجی افسر نے ہیکل سلیمان کے قریب کھڑے ہو کر کہا:

"آج صلیبی جنگوں کا دور ختم ہو گیا۔"

پھر ڈاکٹر پیٹرسن سمتھ نے اپنی کتاب میں جو سیرت مسیح سے متعلق ہے لکھا:

"یہ آٹھویں صلیبی جنگ تھی جس میں مسیحیت نے اپنے آخری مقاصد میں کامیابی حاصل کی۔"

ان واضح تاریخی حقائق کی روشنی میں ہم اسلام کے بارے میں مغرب کے مؤقف کو آسانی سے سمجھ سکتے ہیں۔ اس

کے باوجود مغرب کا یہ ادعا ہے کہ اس نے اپنے مذہب پر کاربند رہتے ہوئے لوگوں میں رواداری کی روح پھونکی۔ حالانکہ جب اس کا اسلام سے مقابلہ ہوتا ہے تو تعصب کا یہ جذبہ پورے زور سے جاگ اُٹھتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حریتِ فکر اور آزادیٔ ضمیر وغیرہ کا فلسفہ جس کی مغرب تبلیغ کر رہا ہے، خود اسی کے عمل سے ختم ہو گیا ہے۔

استعماری عزائم

بلنٹ اپنی کتاب "اسلام کا مستقبل" میں کہتا ہے:

"اسلام کا مرکز خلافت کلیتہً ہمارے قبضہ میں ہونا چاہیے۔ مستقبل کا خلیفہ محض ایک دینی سربراہ ہونا چاہیے۔ اسے آئینی سربراہ کی حیثیت نہیں حاصل ہونی چاہیے۔ کیونکہ اسی صورت میں خلیفہ ایک حلیف اور معاون کی ضرورت محسوس کرے گا۔ اور ہمارا محتاج ہوگا۔"

یورپ مسیحیت پر عملی طور سے کاربند نہیں ہے اور نہ اس کے نقشِ قدم پر چلتا ہے۔ مہذب اور تعلیم یافتہ یورپین اس سے کنارہ کش ہو چکے ہیں اور وہ کبھی کلیسا کا رُخ نہیں کرتے لیکن یورپ، مشرق کے مقابلہ میں ہمیشہ مسیحیت سے تمسک کرتا ہے اور اسلام کے اثر و نفوذ کے خلاف تعصب سے کام لیتا ہے اور مشرق میں اپنے استعمار کو وسعت دینے کے لیے وہ "مسیح کی قبر" ہی کو اپنا نقطۂ آغاز قرار دیتا ہے اور جس طرح وہ مختلف ممالک میں اقلیتوں کی حمایت و تحفظ کے بہانے اپنے استعمار کی جڑیں مستحکم کرنے کے لیے کلیسہ کو مرکز اوّل قرار دیتا ہے اسی طرح مختلف انداز سے بلادِ اسلامیہ میں مسیحیت کو پھیلانے اور اپنے قبضہ و تسلط کے لیے بھی کلیسہ کا سہارا لیتا ہے۔ اسی اسلوب سے اس نے لیبیا کو اپنے تسلط میں لیا اور یہی حربہ فرانس نے تیونس، الجزائر اور مراکش کے مسلمانوں کو کچلنے کے لیے استعمال کیا۔

معرکۂ اسلام کا مؤلف کہتا ہے صلیبی جنگوں میں مغرب نے اپنی تمام تر طاقت مسلمانوں اور عالم اسلامی کے مقابلے میں جھونک دی۔ رہی مسیحیت، تو اس کے لیے یہ خوشی کا مقام تھا کہ یہ زندگی کے مختلف گوشوں میں قوم کے ذہنوں کی تربیت میں مصروف رہی۔ واقعہ یہ ہے کہ جس طرح مغرب اسلام کے نام سے بدکتا اور تلخی محسوس کرتا ہے اور کسی چیز سے نہیں کرتا۔ ۱۸۷۰ء میں برطانوی پارلیمنٹ میں گلیڈسٹون نے ہاتھ میں قرآن پکڑ کر کہا تھا کہ

"جب تک دنیا میں یہ کتاب موجود ہے، ہم مسلمانوں کو زیر کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔"

یہ بات فی الواقع صحیح ہے۔ تمام مقامات میں برطانوی استعمار کی بزدلی ظاہر ہو گئی اور اسلام اپنی پوری شان کے ساتھ دنیا میں باقی ہے۔ اسی سیاست کی بنا پر مغرب نے ہر اس شخص کو نشانۂ ستم بنایا جس نے اسلام کی دعوت دی اور اس کو شش میں آگے بڑھا۔ اس قسم کے حضرات میں سے جمال الدین افغانی بھی شامل ہیں۔

اب مغرب نے مسلمانوں کی اجتماعیت کو ختم کرنے کے لیے ان کو باہمی آویزشوں اور آپس کے لڑائی جھگڑوں پر برانگیختہ کیا۔ جس کے نتیجہ میں ترکوں اور عربوں کے درمیان خصوصیت کے ساتھ نزاع کے آثار ظاہر ہوئے۔ مغرب ہی نے شیعہ سنی جھگڑوں کو ہوا دی۔ اسی نے بربروں اور عربوں کے درمیان اختلاف کی فضا پیدا کی۔ اس وقت ممالک اسلامی کے بارے میں مغرب نے جو نقطۂ نظر اختیار کیا ہے اس کا مقصد ان کو حریت و آزادی سے بہرہ ور کرنا نہیں بلکہ ان کی آپس کی آویزشوں کو بڑھانے کی مختلف شکلیں ہیں۔ مثلاً میسلمون، تحریک عربیت، تحریک عراق، مراکش میں بربری رجحان اور ثقافتیات کی پرورش جو (۱۸۹۹ء اور ۱۹۳۶ء) میں چلی۔ معاہدہ بالفور، فلسطین میں یہودیوں کی آبادکاری وغیرہ، یہ سب ایک ہی نقطۂ فکر کے مختلف مظاہر ہیں اور ان کا مقصد عالم اسلامی کی طاقت کی بنیادوں کو کمزور کرنا ہے۔

(ترجمہ از برید الشرق - جرمنی)